نصاب سازی میں تربیتی واخلاقی جہات (عصری ترجیحات اور فقہ السیرۃ)

*ڈاکٹر سید باچا آغا

Abstract

For the development of Muslim society it is necessary that its people should be trained on the basis of Islamic teachings. This could not be possible until we design a curriculum of seerah which is according to the contemporary needs of character building. The purpose of designing such curriculum is to train our youth in such a way that they would be able not only to take advantage from our rich tradition but also they are well prepared to hold the leadership of the country. We have to keep in mind, while designing seerah curriculum, that it is not revealed. Infact we have to design it according to the needs of hour. If we keep in consideration the ideological and contemporary requisites than we would be able to get the desired results. Islam provides basic principals in this regard. Following these instructions we would be able to design a curriculum which produced the required results.

انسان جسم وروح کا مرکب ہے اور کامل مسلمان وہی ہو سکتا ہے جو اپنے ظاہر کے ساتھ باطنی تعمیر وترقی کیلئے بھی فکر مند ہو، جب کہ باطنی وروحانی ارتقاء کا مدار سنتِ نبویہ اور شریعتِ اسلامیہ کے مطابق عمل پر ہے۔اس لیے ایک مسلم معاشرے کے قیام کیلئے تمام افرادِ معاشرہ کا دینی مزاج ومذاق اور شرعی احکام سے آراستہ ہونالازمی امر ہے۔جس کیلئے افرادِ معاشرہ کے تربیتی واخلاقی جہات کو عصری ترجیحات اور فقہ السیرہ کے دائرے میں منحصر کر کے نصاب کی تشکیل سے ہی یہ امر ممکن ہے۔اور یہ بھی ایک مسلم اور معروف حقیقت ہے کہ نصابِ تعلیم کو نئی نسل کی ذہنی تشکیل وتعمیر اور ملک وملت کی قیادت ورہنمائی کی صلاحیت عطاء کرنے اور قدیم ذخیرہ علوم وتصنیفات سے فائدہ اٹھانے اور عصری ترجیحات کے مطابق فائدہ پہنچانے، بلکہ ملک وملت کی رہنمائی وذہن سازی کی صلاحیت پیدا کرنے میں خاص اور بنیادی دخل ہے۔اسی سے انسان کی تعلیم وثقافت، تہذیب وتمدن، علم وعمل اور حسن کردار وحسن عمل کی تشکیل ہوتی ہے۔اگر ان میں سے کوئی عنصر مفقود یاناقص یامرکزِ توجہ نہ ہو تو یقینی طور پر انسان سازی، مردم گری اور صالح انسانی معاشرہ کی تعمیر میں خلل واقع ہو جائے گا۔اسلام کے دنیا میں آنے کے بعد اس کی پہلی وحی میں پڑھنے، سیکھنے، سکھانے اور قلم کا تذکرہ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ تعلیم وتعلم مسلمانوں کیلئے بنیادی اعمال میں سے ہیں۔قرآن کریم میں جگہ جگہ علوم وفنون کے قسموں کا ذکر

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، سریاب روڈ، کوئٹہ

کرتے ہوئے تعلیم و تعلم، معرفت و تربیت، عقل و تفکیر اور تدبر و بصیرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کو مزید مفید و کارآمد اور مؤثر و سحر انگیز شکل دینے کیلئے قدرت بیان، حلاوت لسان، خوش کلامی اور واضح اوصاف گفتگو کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ یہ سب کچھ اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ اسلام نے روز اول سے ہی تعلیم و تعلم کی نہ صرف ہمت افزائی کی ہے بلکہ اس کا نصاب اور نظام تعلیم مقرر کر کے عصری ترجیحات کو متعین کیا ہے۔

یہ بھی ایک مسلم بات ہے کہ نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کوئی منزل من اللہ حقیقت نہیں کہ اس میں کسی تغیر و تبدل کی گنجائش نہ ہو۔ اصل مقصد دین کے داعی، ملت کے سپاہی، شارح شرع متین اور معلم عقیدہ و دین کی تیاری ہے، ان داعیوں اور سپاہیوں کو عصری ترجیحات مد نظر رکھتے ہوئے ہی اپنی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ لہذا نصاب سازی کے مرحلے میں نظریاتی حدود و قیود کو مد نظر رکھتے ہوئے قوم کے افراد کی ذہنی تعمیر و تشکیل میں حالات حاضرہ اور زمانے کے تقاضوں کی رعایت از حد ضروری ہے ورنہ وہ اپنے کردار کی ادائیگی اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے اہل نہیں ہونگے۔ بہر حال زیر نظر مقالے میں نصاب سازی میں تربیتی و اخلاقی جہات اور اس کی عصری ترجیحات کو فقہ السیرۃ کی روشنی میں تفصیلاً بیان کرنا مقصود ہے۔

نصابِ تعلیم کی بنیاد:

رسول اللہ ﷺ نے حصول تعلیم پر بڑا زور دیا ہے، تاریخ اسلام میں پہلا نصابِ تعلیم رسول اللہ ﷺ نے ہی ترتیب دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے مسجدِ نبوی کی تعمیر کے وقت ایک چبوترہ بنا کر اسلام کی پہلی اقامتی درسگاہ کی بنیاد ڈالی تھی، جہاں آپ ﷺ خود درس دیا کرتے تھے، اپنے دورِ خلافت میں حضرت عمر نے مسجد میں مکتب قائم کر کے ان کی نگہداشت و اخراجات کا ذمہ دار بھی حکومت کو بنایا، آج دورِ جدید میں شہری حکومت کی ذمہ داریوں میں تعلیم کی اشاعت اور فنون کی تربیت بھی شامل ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ علم انبیاء کا ورثہ ہے، مسلمان کو چاہئے کہ جہاں سے ملے لے لے۔

اسلامی نصابِ تعلیم کی اہم نفسیاتی بنیاد یہ ہے کہ ساری دنیا دین کا موضوع ہے اور دین درحقیقت انسان کی بنیادی فطری ضرورت ہے۔ اسلام کا پورا فلسفۂ نصاب اسی نکتہ میں پنہاں ہے۔ یہ نہ ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے اور نہ غلو فی الدنیا کی۔ چنانچہ متوازن اسلامی نصاب کی تشکیل کا مقصدِ اعلیٰ ایسے

متوازن اور صحت مند افراد کی تیاری ہے جو صرف قرآن حکیم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کی طرف متوجہ ہوں، اور ہر دور اور ہر شعبہ زندگی میں صراطِ مستقیم یا دینِ فطرت کے مطابق چلنے اور دوسروں کی رہنمائی کے قابل ہوں۔

نصاب کی بنیادیں، اس کے اجزاو مواد اور اس کے مشمولات کیا ہونے چاہئے، اس نصاب کے ذریعہ قوم وملت کو کیا پیغام ملنا چاہئے، اس کے پڑھنے والے اس کو پڑھ کر کن افکار وخیالات اور نظریات سے بہرہ مند ہونے چاہئے، ان کی نظروں میں کس قدر وسعت اور گہرائی پیدا ہونی چاہئے؟ اس کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب " اسلام اور علم " سے ذیل کے اقتباس کو نقل کرنا بالکل حسب مکان ہو گا، وہ لکھتے ہیں کہ:

" اگر دنیا میں انصاف کے ساتھ تاریخ لکھی جائے اور یہ تحقیق کی جائے کہ علم نے کب اپنا راستہ بدلا؟ وہ کب تعمیر کے بجائے تخریب کا ذریعہ بنا؟ تو ایک منصف آدمی یہ بتائے گا کہ جب سے علم کا رشتہ خالق، مالک، رب کائنات سے ختم ہو گیا، جب ہی سے یہ تباہی اور بربادی آئی۔ جو علم اللہ کے نام سے الگ ہو کر چلا وہ قابلِ اعتبار نہیں رہا، اس علم سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئے۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ معلوم ہو کہ ہمارا خالق کون ہے؟ ہمارا مالک اور پالنہار کون ہے؟ بڑے بڑے دانشوروں، معلموں اور فلسفیوں کو جب یہ نہیں معلوم کہ ان کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ نیکی اور بدی میں کیا فرق ہے؟ ہمارا خالق ہم سے کیا چاہتا ہے؟ وہ ہمیں کس راستہ پر لگانا چاہتا ہے؟ وہ ہمیں کونسا عقیدہ دیتا ہے؟ اس کائنات، عام انسانوں اور اس دنیا اور اس کے انجام کے متعلق اور اپنی ذات کے متعلق ہمارا کیا طرزِ عمل ہونا چاہئے؟ جب ان بنیادی سوالات کا علم نہ ہو تو پھر اس علم کا کیا فائدہ؟ ہم کو یہ تو معلوم ہو کہ اس زہر میں یہ خاصیت ہے کہ وہ ایک منٹ میں سینکڑوں انسانوں کو تباہ وبرباد کر سکتا ہے۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو کہ ہمارا پیدا کرنے والا کون ہے؟ ہماری صلاحیتیں اور ارادے سب اس کے قبضے میں ہیں، وہ عالم الغیب ہے، تو اس علم کا کوئی فائدہ نہیں "۔[1]

نصاب سازی یا کتاب سازی:

اگر نصاب کی نظریاتی اساس اور فکری بنیاد میں کھوکھلا پن ہو اور مذکورہ امور ومقاصد سے ہٹ کر ایک الگ نظریہ پر علمی بنیادوں کو استوار کرنے کی کوشش کی جائے اور غرض نصاب سازی کے بجائے کتاب سازی ہو تو اس سے نکلنے والے نتائج کیا ہوں گے؟ اس بارے میں مولانا عبد الماجد دریا آبادیؒ کا

تبصرہ ملاحظہ جوانہوں نے کسی زمانہ میں ہندوستان کے علمی حلقہ کے علمی افلاس اور ذہنی پسماندگی میں تحریر کیا تھا، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"سرکاری اعداد شائع ہوئے ہیں کہ پچھلے سال چھپنے والی کتابوں کی کل تعداد19 ہزار رہی ہے، اور اخباروں نے اس پر خوب لے دے کی ہے کہ اتنابڑا ملک،50 کروڑ آبادی والا ملک اور اس کی کل مطبوعات کی تعداد کروڑوں کی نہیں، لاکھوں کی نہیں ہزاروں کی، اور ہزاروں میں بھی 80،90 ہزار کی نہیں کل انیس ہزار کی، اور یہ دلیل ہے ملک کے علمی افلاس کی، ذہنی پسماندگی کی، دماغی پستی کی۔ گویا ترقی کا پیمانہ صرف کتابوں کی تعداد ہے، ان کی نوعیت نہیں، یعنی اس سے کوئی بحث ہی نہیں کہ کتابیں کیسی نکلیں؟ کن کن موضوعوں پر نکلیں؟ کس گہرائی کی نکلیں؟ بلکہ دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ کتنی نکلیں ہیں!۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے میز پر کاغذ اور روشنائی کے پہاڑ کے پہاڑ، ہمالئے کے ہمالئے کھڑے ہوگئے۔ ان سے انسان نے کیاپایااور کیا کھویا؟ اس سے کچھ روشنی بڑھی یا تاریکی کی گھٹا اور بھی گھنگھور ہوگئی؟ دنیامیں مقدار خیر وصلاح کی بڑھی یا شر وفساد کی؟ دلوں میں نور کی جلا پیدا ہوئی یا اور زنگ پر زنگ لگتے چلے گئے؟ یہ شعر وغزل، ناول، ڈرامے ،افسانے اور افسانچے جو بے شمار شائع ہوئے، یہ آخر کس طرف لے جارہے ہیں؟ فنونِ لطیفہ کی دعوت کارخ کیارہاہے؟ خود جو بڑے سنجیدہ علوم وفنون کہے جاتے ہیں فلسفہ اور سائنس، تاریخ ومعاشیات ان میں سے بھی بیشتر کاماحصل اور لب لباب کیارہا ہے؟ خدا طلبی، یادِ آخرت، نیک چلنی، حسنِ معاشرت، خیر اندیشی، تحمل، صبر، ضبطِ نفس، صلح جوئی اور ہمدردی یا اس کے برعکس غفلت وانانیت، خدافراموشی اور آخرت بیزاری، خود غرضی اور دنیا طلبی، حرص وہوس، ظلم ونفس پرستی؟! حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر سے ایک سرسری جائزہ لے ڈالئے، اور خود سوچئے کہ اس ترقی اور وسعتِ کتاب سازی کے کیا نتیجے نکل چکے ہیں؟ کیا نکل رہے ہیں؟ اور آئندہ کیا نکلنے والے ہیں؟"۔[2]

اسلام میں دین ودنیا کی تفریق نہیں، اور اسلامی نظامِ حیات دین ودنیا دونوں کی صلاح وفلاح اور کامیابی وکامرانی پر مشتمل ہے، آخرت کا راستہ دنیاہی سے ہو کر گزرتا ہے، اسی بناپر احادیثِ مبارکہ میں دنیا کو آخرت کی کھیتی اور میدانِ عمل بتایا گیاہے۔ لہٰذا اسی عقیدہ اور نصب العین سے اسلامی نظامِ تعلیم کو بھی مستثنیٰ نہیں، لہٰذا نصاب کے اجزا میں ان دونوں انتہاؤوں کو یکجا کئے بغیر صحیح اور مطلوبہ ہدف تک

رسائی مشکل ہے۔" چنانچہ اس نصاب کے پڑھنے والے تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے اتنے مستحکم اور مضبوط ہونے چاہئیں کہ وہ کسی باطل نظام سے مرعوب نہ ہوں، اور ہمیشہ تنقیدی صلاحیتوں سے کام لیکر اسے اسلام کی کسوٹی پر پرکھیں۔ وہ دوسروں کے علوم وفنون کو حاصل بھی کریں، لیکن مرعوب ومغلوب ذہن سے نہیں بلکہ غالب اور ناقدانہ ذہن سے۔ اس رہنما نقطے کے تناظر میں تعلیم کی ہر سطح اور ہر شاخ میں نفسیاتی اصول کے حوالے سے نصاب میں ایسا لوازمہ شامل کیاجائے جس کے نتیجے میں طلبہ کو توحید ، نبوت، وحی، اخروی جزا و سزا، خیر وشر کا علم اور اس پر ایمان، پھر خدا کی نازل کردہ الہامی ہدایت کا علم اور اس کے ساتھ اسوۂ نبوت یا کتاب اللہ کی اس قولی وعملی تشریح کا علم جسے سنت رسول اللہ کہتے ہیں۔ آخر میں تفسیر وحدیث سے متعلق علوم اور فقہ اجتہاد کے اصول وطریقہ کا علم حاصل ہو جائے"۔[3]

طریقہ تعلیم وتشکیلِ نصاب میں تغیر وتبدل کو روا رکھتے ہوئے اس امر سے قطعاً صرفِ نظر نہیں کیاجاسکتا کہ نصاب محض ڈرائنگ کا سادہ خاکہ نہ ہو کہ جو رنگ آنکھوں کو بھاجائے وہی اس میں بھر دیاجائے، بلکہ زمانہ کے حالات کے مطابق عصری ترجیحات اور جدید و ضروری مضامین کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسے موادواجزاء کا انتخاب کرنا ضروری ہے جو نسلِ نو کی ذہنی وفکری تعمیر وتشکیل میں اہم اور کلیدی کردار ادا کرکے اس کو ایسی منزل کی طرف گامزن کرسکے جہاں وہ اپنے اسلاف کے عظیم کارناموں، ان کی کوششوں، ان کی صلاحیتوں اور اس سے بڑھ کر مقصدِ تخلیقِ کائنات سے بے بہرہ نہ رہ سکیں، اور اپنے خالق ومالک کی صحیح معرفت حاصل کرکے اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رقمطراز ہیں کہ:

"ضرورت ہے کہ خاص توجہ اور تربیت سے طلبہ میں علمی ذوق پیدا کیاجائے، نصاب کے سوا طلبہ کو اچھا اسلامی لٹریچر دکھایاجائے، اور ان ائمہ اور مفکرینِ اسلام کی تصانیف کا ذوق پیدا کیاجائے جن کی کتابوں میں اسلام کی صحیح روح ملتی ہے، علم واجتہاد کے چشمے ابلتے ہیں، اسلام کی بنیادیں قلب ودماغ میں مستحکم ہوتی ہیں۔ کتابوں کا صحیح انتخاب اور ان کی صحیح ترتیب کے متعلق مشورہ مدرسین کے اہم فرائض میں سے ہے، اور ذہنی اور مذہبی تربیت کیلئے نہایت ضروری ہے۔ اسلام کے مستند ماضی کے اہم اشخاص سے واقف ہونا، ان کے مراتب کو پہچاننا، ان کی خدمتوں سے واقف ہونا اور اعلیٰ ومجتہدانہ اسلامی تصنیفات سے روشناس ہونا تعلیم کا اہم جزو ہے"[4]۔ ایک اور

مقام پر اسی پس منظر میں لکھتے ہیں کہ: ”اب اس امت کے لئے جو دانش گاہ تعمیر کی جائے، جو نظامِ تعلیم مرتب کیا جائے، اس میں جو بنیادی چیز ہو، جو اصل کار فرما اور راہنما اصول ہے، وہ یہ ہے کہ یہ علم، یہ نظامِ تعلیم ان اقدار پر، ان حقائق پر اور ان عقائد پر ایمان کو راسخ کرے، اور یہ پختگی صرف دل کی راہ سے نہیں بلکہ دماغ کی راہ سے بھی ہو، یعنی دل و دماغ دونوں مطمئن ہونے چاہئیں۔ اگر دل و دماغ دونوں مطمئن نہیں ہیں تو فرد کی زندگی میں کشمکش پیدا ہو گی، اور یہ کشمکش پھر وسیع ہوتی جائے گی۔ پہلے وہ اپنے اندر ایک دوسرے سے دست بگریباں پھر جماعت سے دست بگریباں ہو گا“۔[5]

جبری طرز تعلیم:

جبری نظامِ تعلیم جس میں ہر قسم کے رطب و یابس شامل ہوں اور اس سے نسلِ نو کے ذہن پر پڑنے والے منفی اثرات کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں کہ: ”کسی جبری نظامِ تعلیم میں جس کا پڑھنا مسلمان بچوں کے لئے ضروری ہو، ایسی کتابوں کا داخلِ نصاب ہونا مسلمانوں کے لئے سخت تکلیف دہ امر ہے جس سے انہیں اپنے مذہب، اپنے وجودِ ملی، اپنے عقیدہ اور اپنی آئندہ نسلوں کے مستقبل کے لئے شدید خطرہ لاحق ہوتا ہو“[6]۔ اس طرزِ تعلیم کے نتائج و عواقب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ندویؒ لکھتے ہیں کہ: ”مسلمانوں کو اپنے بچوں کے لئے ذہنی اور دینی ارتداد کا جو خطرہ نظر آرہا ہے وہ محض وہم و تخیل پر مبنی نہیں، واقعات اور آثار اس کی تصدیق کرتے ہیں، ان حلقوں میں جہاں موجودہ نظامِ تعلیم کا گہرا اثر پڑا ہے اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے جن کا تعلق نہیں رہ سکا اس تعلیم کے اثرات نمایاں ہونے لگے ہیں۔ خاندانوں کے معصوم بچے اور بچیاں غیر اسلامی اور صریح مشرکانہ عقائد و رسوم سے متاثر نظر آنے لگی ہیں، جو مسلمانوں کے لئے بڑی تشویش اور کشمکش کا سبب ہے“۔[7]

اسی ذہنی انتشار و کشمکش اور فکری پراگندگی کو نئی نسل کی نونہالوں میں قریب سے دیکھنے اور اس کے اثرات کو صرف محسوس ہی نہیں بلکہ ملاحظہ کرنے کے بعد مشہور یگانۂ روزگار ادیب و مفسر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ بڑی افسردگی اور ملتِ اسلامیہ سے بڑی مایوسی کے ساتھ اپنے تاثرات لکھتے ہیں کہ:

”مسلمان والدین کی 12 سال کی بچی کو سرے سے یہ خبر ہی نہیں کہ عید ہے کیا چیز؟ اور اس کی کیا اہمیت ایک مسلمان کے لئے ہے؟ اور روزہ اور رمضان کا تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس نے نام ہی نہیں سنا ہے۔ عید گاہ یا مسجد کا کوئی تصور اس کے ذہن میں نظر نہیں آتا، اس کا باپ مع کچھ اور باپوں کے بس

ایک کرایہ کے چرچ ہال میں جا کر (prayer) کر آتے ہیں، اور جیسے اس عبادت کا تعلق بجز کچھ باپوں کے اور کسی سے ہے ہی نہیں، معانقہ اس کی نظر میں صرف ایک دوسرے کی شانوں پہ گر پڑنا ہے، اور درود و سلام یا کلمۂ شہادت یا کلماتِ تکبیر کے بجائے اس کے کان صرف (very happy Christmas) سے آشنا ہیں"۔ ایک اور جگہ پر وہ رقم طراز ہیں کہ: "آہ! وہ امت جو اپنے ہاں کی تعلیمات و روایات کو یوں بھلا چکی ہے، دنیا کی ہوس میں پڑ کر آخرت کو اپنے ذہن سے یوں خارج کر چکی ہے، اور اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قصرِ جہنم کی طرف یوں دھکیلتی جا رہی ہے، اور پھر انتہائی ڈھٹائی سے فریاد بھی یہ برپا کرتی جا رہی ہے کہ دوسری قوموں نے اس پر دنیا تنگ کر رکھی ہے، اور وہ سراسر مظلوم اور ہر نعمت سے محروم ہو کر رہ گئی ہے، ایک اس برطانوی مثال کو چھوڑئے، ہندوستان ہی میں کتنے بچوں کو صحیح اسلامی تعلیم دی جاتی ہے؟!۔"[8]

نصاب کے بارے میں ایک ضروری امر یہ ہے کہ غیر ضروری اور غیر مفید تعلیم سے اسے بھاری بنا کر طالب علم کو اس کے بوجھ تلے دبا نہ دیا جائے۔ یہ مسئلہ انتہائی غور و فکر، مہارت اور لکیر پیٹنے کی ذہنیت سے آزاد ہو کر اقدامات کرنے کا طالب ہے۔ یہ طرزِ فکر کہ ہر قومی مسئلے کا حل یہ ہے کہ فلاں چیز نصاب میں شامل کر دی جائے، مناسب نہیں۔ اس طرح طالب علم کو غیر ضروری بوجھ سے لادنے سے اس کی دلچسپی سرے سے حصولِ علم میں ختم ہو جاتی ہے۔ نصابی حکمتِ عملی کا ایک اہم جزو یہ ہونا چاہئے کہ نصابات کی مسلسل چھانٹی کی جاتی رہے، ثانوی جماعت تک کے لازمی نصاب سے اس طرح کی تمام باتیں نکال دینی چاہئیں جو نوے فیصد افراد کی ساری زندگی کسی کام نہیں آتیں، لیکن وہ باتیں ضرور شامل ہونی چاہئیں جو کام آتی ہیں۔[9]

غیر ضروری مواد کی گنجائش نصابات کی تیاری میں ہرگز نہ رکھنی چاہئے، ایسے مواد جن کا نہ کوئی دنیوی نفع ہو نہ اخروی، متعدد احادیث میں اس کو اختیار کرنے اور اس کے بارے میں بحث و مباحثہ کرنے سے نہ صرف یہ کہ منع کیا گیا ہے بلکہ ان کو آخرت میں قابلِ مؤاخذہ و گرفت بتایا گیا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ المصابیح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث نقل کی گئی ہے، جس سے اس بارے میں بڑی رہنمائی ملتی ہے۔

عن ابی هريرة قال: خرج علينا رسول الله عليه وسلم ونحن نتنازع في

القدر فغضب حتی احمرّ وجهه حتی كأنما فقئ فی وجهه حب الرمآن،فقال:ابهذا امرتم ام بهذا ارسلت الیكم؟انّما هلك من كان قبلكم حين تنازعوا فی هذا الامر فأذا عزمت عليكم عزمت عليكم ان لا تنازعوا فيه۔[10]

مظاہر حق میں نواب قطب الدین خان اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

صحابہ آپس میں تقدیر کے مسئلہ پر بحث کررہے تھے، بعض صحابہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے نوشتہ تقدیر کے مطابق ہیں،تو پھر ثواب وعذاب کا ترتب کیوں ہوتا ہے؟جیسا کہ معتزلہ کا مذہب ہے اور کچھ حضرات یہ کہہ رہے تھے کہ اس میں خدا کی کیا مصلحت و حکمت ہے کہ بعض انسانوں کو تو جنت کیلئے پیدا کیا اور بعض انسانوں کو دوزخ کیلئے پیدا کیا ہے؟کچھ صحابہ نے اس کا جواب دیا کہ یہ اس لئے ہے کہ انسانوں کو کچھ اختیارات بھی اعمال کے کرنے اور نہ کرنے کے دے دئے ہیں۔کچھ نے کہا کہ یہ اختیار کس نے دیا ہے؟بہر حال اس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی اور اپنی عقل ودانش کے بل بوتے پر خدا کے اس راز و مصلحت کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جارہی تھی کہ سرکارِ دوعالم ﷺ نے جب ان کو اس بحث ومباحثہ میں مشغول پایا تو غصہ وغضب سے چہرہ مقدس سرخ ہو گیا،اس لئے صحابہ کو بتلادیا گیا کہ یہ تقدیر کا مسئلہ خدا کا ایک راز وبھید ہے جو کسی پر ظاہر نہیں کیا گیا ہے ۔لہٰذا اس میں اپنی عقل لڑانا اور غور وتحقیق گمراہی کی راہ اختیار کرنا ہے،چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس لئے دنیا میں نہیں بھیجا گیا ہوں کہ تقدیر کے بارے میں بتاؤں اور تم اس میں بحث ومباحثہ کرو،میری بعثت کا مقصد صرف یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے احکام تم لوگوں تک پہنچادوں،اور اطاعت وفرمان برداری کی راہ پر تمہیں لگاؤں،دین وشریعت کے فرائض واعمال کے کرنے کا تمہیں حکم دوں،لہٰذا ایک سچے ومخلص ہونے کے ناطے پر صرف اتنا ہی فرض ہے کہ تم ان احکام وفرائض پر عمل کرو اور جن اعمال کے کرنے کا تمہیں حکم دوں اس کی بجا آوری میں لگے رہو،تم اس تقدیر کے مسئلے میں مت پڑو،پس اتنا ہی اعتقاد تمہارے لئے کافی ہے کہ یہ خدا کا ایک راز ہے جس کی حقیقت ومصلحت وہی جانتا ہے،اس کو اس کی مرضی پر چھوڑو۔[11]

اس حدیث میں ایک عمومی اصول وضابطہ بیان کیا گیا ہے اور صالح ومفید اور مؤثر اور غیر مفید وغیر ضروری کے درمیان ایک حدِفاصل بیان کی گئی ہے،ایک قانون دیا گیا ہے کہ ہر اس

گفتگو، مباحثے، مواد، اور لٹریچر کو دیکھنے، پڑھنے، سننے اور سنانے سے احتراز برتنا چاہئے کہ جو انسان کے لئے باعث گمراہی اور دنیوی واخروی ہلاکت کا سبب ہو۔ لہٰذا اس حدیث میں جہاں مسئلہ تقدیر میں غور وخوض کرنے سے باز رہنے کی تلقین وتاکید کی گئی ہے وہاں ہر اس چیز سے بھی سختی کے ساتھ روکا گیا ہے جو اس مسئلے میں پڑنے کے لئے وسیلہ اور سبب بن سکتی ہو۔ اب اس بات کی تعین کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی اور اس بات میں کوئی دورائے نہیں ہوسکتی کہ ان مسائل میں پڑنے یا نہ پڑنے کا تعلق نصاب کی صحت یا فساد سے کس قدر گہری ہے۔ اور اگر اس طرف التفات نہ کی گئی تو اس عدمِ توجہی کے کیسے بھیانک نتائج برآمد ہوسکتے ہیں؟

جہاں نصاب کی صحت وافادیت کو اہمیت حاصل ہے وہاں یہ بات بھی انتہائی قابلِ توجہ ہے کہ واضعینِ نصاب ونظام ایسے افراد ہونے چاہئیں جو ملک وملت کے فرزندوں کی بہی خواہی کے جذبہ سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی فکر کی سلامتی، عقیدہ کی درستگی، اخلاق کی برتری اور نگاہ کی بلندی جیسے تمام عالی اوصاف سے آراستہ وپیراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ عصری تحدیات سے بھی واقف ہو۔ اگر واضعین نصاب کے افکار وخیالات فاسد اور کھوکھلے ہوں تو اس کے جرثومے نہ صرف یہ کہ نونہالان ملت کے ذہنوں میں پھیل جائیں گے بلکہ وہ اس طرح سے پیوست ہوجائیں گے کہ ان کو الگ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجائے گا۔ اس سلسلے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں کہ:

"اہل نظر جانتے ہیں کہ انسانی وجود کی طرح نظامِ تعلیم بھی اپنی ایک روح اور ضمیر رکھتا ہے، یہ روح اور ضمیر دراصل اس کے واضعین ومرتبین کے عقائد ونفسیات، زندگی کے متعلق ان کے نقطہ نظر، مطالعہ کائنات وعلم اسماء کی اساس ومقصد اور ان کے اخلاق کا عکس اور پرتو ہوتا ہے، جو اس نظام کو ایک مستقل شخصیت، ایک مستقل روح اور ضمیر عطا کرتا ہے۔ یہ روح اس کے پورے ڈھانچہ، ادب وفلسفہ، تاریخ، فنونِ لطیفہ، علومِ عمرانیہ، حتی کہ معاشیات وسیاسیات میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے کہ اس کو اس سے مجرد کرنا بڑا کٹھن کام ہے"۔[12]

ہم فکر افراد کا انتخاب:

نصاب کے پڑھانے والوں کی ذہنی وفکری درستگی اور سلامتی کو نصاب کی اساس، اس کی

افادیت ونافعیت اور اس کی صالحیت کو نمایاں اور اجاگر کرنے میں بہت کچھ داخل ہے۔ کسی بھی نصاب کی روح اس وقت تک صحیح طرح اس کے پڑھنے والوں کے ذہن ودماغ اور افکار وخیالات میں منتقل نہیں ہوسکتی جب تک اس نصاب ونظام کے موافق وہم خیال افراد اس کو میسر نہ ہوں۔ لہٰذا نصاب کی افادیت ونافعیت کو آشکارا کرنے کیلئے اس کے ہم فکر افراد کا انتخاب انتہائی ناگزیر ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں کہ:

"نصابِ درس کسی جماعت کے پیدا کرنے کا تنہا ضامن نہیں، وہ ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے جو کسی جماعت کے پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔۔۔ایسی جماعت کے پیدا ہونے کا بہت کچھ انحصار اس نصاب کے اساتذہ اور مدرسہ کے موافق ماحول پر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اساتذہ کی خوبی نصاب کے نقائص کی بہت حد تک تلافی کر سکتی ہے، لیکن بہتر سے بہتر نصاب معلمین کا قائم مقام نہیں ہوسکتا"[13]۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مزید لکھتے ہیں کہ:

"دوسری بنیادی ضرورت ان اساتذہ کی تیاری اور تربیت ہے جو اس تحریک اور ادارہ کے تعلیمی نقطہ نظر اور تخیل سے نہ صرف یہ کہ پورا اتفاق رکھتے ہوں، بلکہ اس کے پرجوش داعی اور اس کا عملی نمونہ ہوں، اور جو اپنی علمی اور تدریسی صلاحیت، ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ اس طریقہ تعلیم کو کامیاب بنانے میں صرف کریں، اور دوسرے نظامہائے تعلیم کے مقابلہ میں اس کا امتیاز ثابت کر سکیں"۔[14]

اگر نصاب کی بنیادوں میں صالح اور مفید وصحت مند اجزا نہ ہوں تو نہ صرف یہ کہ ساری جدوجہد اور کاوشیں "کوہ کندن وکاہ بر آوردن" کے مصداق ہوں گے، بلکہ پوری نسل اس کو تاہی اور غفلت کا شکار ہو کر روبزوال ہو جائے گی، اور پھر کوئی بڑی سے بڑی دانش گاہ اس کی تلافی سے قاصر ہوگی۔ دانش گاہوں میں ہوتے ہوئے دانستہ بے دانشی کا ارتکاب وہ جرم ہے جس نے ہمیشہ "یک لحظہ غافل بودم وصد سال راہم دور شد" کی کرشمہ سازیاں دکھائی ہے۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

"اب کسی ملک کی یہ تعریف نہیں کہ وہاں کتنی یونیورسٹیاں ہیں، یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہوگئی ہے، بلکہ قابلِ قدر بات یہ ہے کہ علم کے شوق میں، ریسرچ کی راہ میں اور علم کے پھیلانے کے جذبہ سے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں۔ اپنی قوم کو صاحبِ شعور، مہذب اور باضمیر قوم بنانے کیلئے

کتنی تعداد میں وہ نوجوان موجود ہیں جو اپنی ذاتی سربلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کر کے اس مقصد کیلئے اپنے آپ کو وقف کرتے ہیں۔ اصل معیار یہ ہے اور یہی ہونا چاہئے۔ کتنے نوجوان ایسے ہیں کہ جو دنیا کی تمام آسائشوں اور ترقیوں سے آنکھیں بند کر کے کسی گوشہ میں ٹھوس علمی کام کر رہے ہیں، ملت کی سربلندی کیلئے یا کسی نظریہ کی دریافت کیلئے یا کسی علمی تحقیق کے لئے اور اپنے ملک کو طاقت ور بنانے کیلئے۔ یہی دو حقیقی مقصد ہیں، باقی صرف پڑھا لکھا دینا اور ملازمت کے قابل بنا دینا میں سمجھتا ہوں اب کسی جامعہ کیلئے قابلِ تعریف نہیں"۔[15]

فکر و نظر اور قلبی میلان کی درستگی اور قوم ملت کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ سے حصولِ تعلیم کے فقدان پر اپنی گہرے رنجیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مولانا عبد الماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں کہ:

"کاش یہ ہنر آپ نہ سیکھے ہوتے، کاش ان علوم وفنون سے آپ جاہل ہی رہتے، کاش یہ ننگِ انسانیت "معزز پیشے" آپ کی شرکت سے محروم رہتے، کاش ان آمدنیوں سے آپ کی جیبیں بوجھل نہ ہوتیں، دوسرے انسانوں، اپنے ہم جنسوں کے خون چوسنے سے قبل کاش ہمارا ہی خون خشک ہو گیا ہوتا!!"۔[16]

تربیتی واخلاقی جہات:

تربیت واخلاق کا تہذیب و تمدن سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور اسلامی تہذیب و تمدن کی گویا بنیاد ہی تربیت واخلاق پر ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الاَخلَاقِ۔[17] "میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں"

لیکن بدقسمتی سے جب اہل اسلام کے ہاتھوں اسلامی تہذیب کمزور ہوئی تو بہت سی باتوں کی طرح حفظ مراتب کی قدر بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھی۔ اب برابری کا ڈھنڈورا پیٹا گیا اور بچے ماں باپ کے برابر کھڑے ہو گئے جبکہ شاگرد استاد کے برابر۔ جس سے وہ ساری خرابیاں در آئیں جو مغربی تہذیب میں موجود ہیں۔ یہ مسلمانوں کیلئے کسی المیہ سے کم نہیں۔ اس کے برعکس جاپان کی مثال لیں جہاں تیسری جماعت تک بچوں کو ایک ہی مضمون سکھایا جاتا ہے اور وہ "اخلاقیات" و"آداب" ہیں۔ علامہ عبد اللہ سراج الدین لکھتے ہیں کہ: الأخلاق الفاضلة والآداب الكاملة لها منزلتها الرفيعة[18] "اخلاق فاضلہ اور آداب کاملہ (کے حاملین) کیلئے بلند منزلیں ہیں" پتہ نہیں کہ جاپان والے اس کتاب

اور صاحب کتاب کو کیسے جانتے ہیں اور ہمیں ابھی تک یہ بات معلوم کیوں نہ ہو سکی؟ بہر حال، اس پر عمل کی ذمہ داری فی الحال جاپان والوں نے لی ہوئی ہے جو بلند منزلوں کے حاملین بھی بنے ہیں اور ہم ابھی تک خواب غفلت کے شکار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک پروفیسر جاپان گئے تھے اور ایئر پورٹ پر پہنچ کر انہوں نے اپنا تعارف کروایا کہ وہ ایک استاد ہیں اور پھر ان کو لگا کہ شاید وہ جاپان کے وزیر اعظم ہیں۔ یہ ہے قوموں کی ترقی اور عروج وزوال کا راز۔ سوشل میڈیا پر ایک پوسٹ کچھ عرصے سے گردش میں ہے جسے پڑھ کر ہر ایک انسان ورطہ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ اس پوسٹ میں لکھا ہے کہ: ایک ڈاکٹر اکثر نسخے پر ڈسپنسر کو لکھتے کہ اس مریض سے پیسے نہیں لینے اور جب کبھی مریض پوچھتا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے پیسے کیوں نہیں لیے؟ تو وہ کہتے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ جس کا نام صدیق ہو، عمر ہو، عثمان ہو، علی ہو یا خدیجہ ،عائشہ اور فاطمہ ہو تو میں اس سے پیسے لوں۔ ساری عمر انہوں نے خلفائے راشدین، امہات المومنین اور بنات رسول ﷺ کے ہم نام لوگوں سے پیسے نہ لیے۔ یہ ان کی محبت اور ادب کا عجیب انداز تھا۔[19]

ادب واحترام اور تربیتی واخلاقی جہات کے باب میں حضور ﷺ کے ایک صحابی سے یہ فرمان ملاحظہ ہو۔ جب صحابی سے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ آپ بڑے ہیں یا میں؟ (عمر پوچھنا مقصود تھا):

أنتَ أكبَرُ أمْ أنا، فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ أنتَ أكبَرُ مِنِّي وَأنَا أقدَمُ مِنكَ۔[20]

"(صحابی نے کہا) یا رسول اللہ ﷺ بڑے تو آپ ہی ہیں البتہ عمر میں، میں آگے ہوں۔ (یعنی عمر میری زیادہ ہے)"

صحابی نے کمال تربیت و ادب کا خیال رکھتے ہوئے حضور ﷺ کیلئے اَکبَرُ اور اپنے لئے اَقدَمُ کا لفظ استعمال کیا۔ یہ ہے رسول اللہ ﷺ کی تربیت واخلاقی تعلیم کا وہ مظہر جس سے ہر ایک شاگرد منور دکھائی دیتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ دریائے دجلہ کے کنارے وضو فرما رہے تھے کہ ایک اور شخص بھی وضو کرنے آئے، لیکن فوراً ہی اٹھ کھڑے ہو کر امام صاحبؒ سے آگے نیچے کی طرف جا کر وضو کرنے لگے۔ پوچھنے پر کہا کہ دل میں خیال آیا کہ میری طرف سے پانی بہہ کر آپؒ کی طرف آرہا ہے، مجھے شرم آئی کہ امامؒ میرے مستعمل پانی سے وضو کرے۔ کسی شخص نے اس آدمی کو وفات کے بعد خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے کہا کہ وضو کرنے میں امامؒ کی تعظیم کرنے

کے باعث اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بخش دیا۔[21]

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ رات کو سوتے ہوئے یہ احتیاط کرتے کہ پاؤں استاد کے گھر کی طرف نہ ہوں اور بیت الخلا جاتے ہوئے یہ احتیاط کرتے کہ جس قلم سے لکھ رہا ہوں اس کی کوئی سیاہی ہاتھ پر لگی نہ رہ جائے۔ چنانچہ ایک دن آپؒ اسرار و معارف تحریر فرمارہے تھے ناگاہ ضرورت بشری کی وجہ سے بیت الخلاء تشریف لے گئے، تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ باہر تشریف لائے اور پانی طلب کر کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کو دھویا اور فرمایا:

ناخن پر سیاہی کا دھبہ تھا اور سیاہی حروف قرآنی کے اسباب کتابت میں سے ہے بنابریں لائق ادب نہ سمجھا کہ اس دھبہ کے ہوتے ہوئے طہارت کروں۔[22]

ادب کے یہ انداز اسلامی تہذیب کا طرہ امتیاز رہا ہے اور یہ کوئی برصغیر کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ جہاں جہاں بھی اسلام گیا اس کی تعلیمات کے زیر اثر ایسی ہی تہذیب پیدا ہوئی جس میں بڑوں کے ادب کو خاص اہمیت حاصل تھی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ :

لَيسَ مِنَّا مَن لَم يَرحَم صَغِيرَنَا وَلَم يُوَقِر كَبِيرَنَا۔[23]

"جو بڑوں کا ادب نہیں کرتا اور چھوٹوں سے پیار نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں"

ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ لوگ ماں باپ کے برابر بیٹھنا، ان کے آگے چلنا اور ان سے اونچا بولنا برا سمجھتے تھے اور اُن کے حکم پر عمل کرنا اپنے لیے فخر جانتے تھے۔ اس کے صدقے اللہ انہیں نوازتا بھی تھا۔ اسلامی معاشروں میں یہ بات مشہور تھی کہ جو یہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کے رزق میں اضافہ کرے وہ والدین کے ادب کا حق ادا کرے اور جو یہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کے علم میں اضافہ کرے وہ استاد کا ادب کرے۔

والدین کی طرح استاد کا ادب بھی اسلامی معاشروں کی ایک امتیازی خصوصیت تھی اور اس کا تسلسل بھی صحابہ کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ حضور ﷺ کے چچازاد حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اساتذہ کے سامنے تواضع اور انکساری کا اظہار کرتے تھے۔ کسی صحابی سے کوئی حدیث حاصل کرنے جاتے تو جاکر ان کے گھروں کی دہلیز پر بیٹھ جاتے اور استاد کے نکلنے کا انتظار کرتے۔ اس کا دروازہ کھٹکھٹانا بھی ادب کے خلاف سمجھتے اور جب وہ صحابی خود ہی باہر نکلتے تو ان سے حدیث پوچھتے۔ آپ استاد کے سامنے یوں گویا

ہوتے کہ میں علم کا طالب ہوں، میرا دل نہ چاہا کہ آپ میری وجہ سے اپنی ضروریات سے فارغ ہونے سے پہلے آئیں۔ اس دوران سخت گرمی میں پسینہ بہتا رہتا، لو چلتی رہتی مگر آپ برداشت کرتے رہتے۔[24]

کتنی ہی مدت ہمارے نظامِ تعلیم میں یہ رواج رہا (بلکہ اسلامی مدارس میں آج بھی ہے) کہ ہر مضمون کے استاد کا کمرہ مختص ہوتا، وہ وہیں بیٹھتے اور شاگرد خود چل کر وہاں پڑھنے آتے۔ جبکہ اب شاگرد کلاسوں میں بیٹھے رہتے ہیں اور استاد سارا دن چل چل کر ان کے پاس جاتا ہے۔ مسلمان تہذیبوں میں یہ معاملہ صرف والدین اور استاد تک ہی محدود نہ تھا بلکہ باقی رشتوں کے معاملے میں بھی ایسی ہی احتیاط کی جاتی تھی۔ وہاں چھوٹا، چھوٹا تھا اور بڑا، بڑا۔ چھوٹا عمر بڑھنے کے ساتھ بڑا نہیں بن جاتا تھا بلکہ چھوٹا ہی رہتا تھا۔ جب کہ اب یہ معاملہ مسلمانوں کے بجائے یورپین اقوام نے اپنایا ہے اسی وجہ سے وہ ترقی کے منازل طے کرتے جا رہے ہیں۔ اشفاق احمد صاحب کا ایک واقعہ مشہور ہے جسے ہر ایک بطور مثال پیش کرتا ہے کہ ان کو ایک دفعہ اٹلی میں عدالت جانا پڑا اور انہوں نے بھی اپنا تعارف کروایا کہ میں استاد ہوں وہ لکھتے ہیں کہ جج سمیت کورٹ میں موجود تمام لوگ اپنی نشستوں سے کھڑے ہوگئے۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ قوموں کی عزت کا راز استادوں کی عزت میں ہے۔ استادوں کو عزت وہی قوم دیتی ہے جو تعلیم کو عزت دیتی ہے اور اپنی آنے والی نسلوں سے پیار کرتی ہے۔ لہذا اگر اپنے نوجوان نسل کو کامیابی سے ہمکنار دیکھنا چاہتے ہیں تو عصری ضروریات سے ہم آہنگ نظریاتی نصاب سازی کے ساتھ ساتھ تربیتی و اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کو اولیت دینا ہوگا ورنہ تمام تر کوششیں سعی لاحاصل کے زمرے میں آئیں گے۔

عصری ترجیحات سے چشم پوشی:

ابھی تک تو ہم نصاب تعلیم، اس کی بنیاد، اس کے تقاضے، جبری طرز تعلیم، نصاب سازی یا کتاب سازی اور نصاب کے حوالے سے ہم فکر افراد کے انتخاب وغیرہ کے حوالے سے بحث کر رہے تھے اب ذرا اسالیبہ کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو تمام تر ناکامیوں کی جڑ ہے۔

آپ حیران ہوں گے میٹرک کلاس کا پہلا امتحان برصغیر پاک و ہند میں 1858ء میں ہوا، اور برطانوی حکومت نے یہ طے کیا کہ برصغیر کے لوگ ہماری عقل سے آدھے ہوتے ہیں، اس لیے ہمارے پاس "پاسنگ مارکس" 65 ہیں تو برصغیر والوں کے لیے 32 اعشاریہ 5 ہونے چاہئیں۔ دو سال بعد 1860ء میں اساتذہ کی آسانی کے لیے پاسنگ مارکس 33 کر دیے گئے اور ہم 2018ء میں بھی ان ہی 33 نمبروں

سے اپنے بچوں کی ذہانت کو تلاش کرنے میں مصروف ہیں[25]۔ جاپان میں معاشرتی علوم "پڑھائی" نہیں جاتی ہے۔ کیونکہ یہ سکھانے کی چیز ہے اور وہ اپنی نسلوں کو بہت خوبی کے ساتھ معاشرت سکھا رہے ہیں۔ جاپان کے اسکولوں میں صفائی ستھرائی کیلئے بچے اور اساتذہ خود ہی اہتمام کرتے ہیں۔ صبح آٹھ بجے اسکول آنے کے بعد سے 10 بجے تک پورا اسکول بچوں اور اساتذہ سمیت صفائی میں مشغول رہتا ہے۔ دوسری طرف آپ ہمارا تعلیمی نظام ملاحظہ کریں جو صرف نقل اور چھپائی پر مشتمل ہے، ہمارے بچے "پبلشرز" بن چکے ہیں۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ جو کچھ کتاب میں لکھا ہوتا ہے اساتذہ اسی کو بورڈ پر نقل کرتے ہیں، بچے دوبارہ اسی کو کاپی پر چھاپ دیتے ہیں، اساتذہ اسی نقل شدہ اور چھپے ہوئے مواد کو امتحان میں دیتے ہیں۔ اکثر وبیشتر خود ہی اہم سوالوں پر نشانات لگواتے ہیں اور خود ہی پیپر بناتے ہیں اور خود ہی اس کو چیک کر کے خود نمبر بھی دے دیتے ہیں۔ بچے کے پاس یا فیل ہونے کا فیصلہ بھی خود ہی صادر کر دیتے ہیں اور ماں باپ اس نتیجے پر تالیاں بجا بجا کر بچوں کے ذہین اور قابل ہونے کے گن گاتے رہتے ہیں۔ جن کے بچے فیل ہو جاتے ہیں وہ اس نتیجے پر افسوس کرتے رہتے ہیں اور اپنے بچے کو "کوڑھ مغز" اور "کند ذہن" کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔ اب ایمانداری سے بتائیں اس سب کام میں بچے نے کیا سیکھا۔ سوائے نقل کرنے اور چھاپنے کے؟۔ ہم 13، 14 سال تک بچوں کو قطار میں کھڑا کر کر کے اسمبلی کرواتے ہیں اور وہ اسکول سے فارغ ہوتے ہی قطار کو توڑ کر اپنا کام کرتے وکرواتے ہیں۔ جو جتنے بڑے اسکول سے پڑھا ہوتا ہے، قطار کو روندتے ہوئے سب سے پہلے اپنا کام کروانے کا ہنر جانتا ہے۔ ہم پہلی سے لے کر دسویں تک اپنے بچوں کو "سوشل اسٹڈیز" پڑھاتے ہیں اور معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ یہ بتانے اور سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ ہم نے کتنا "سوشل" ہونا سیکھا ہے؟۔ اسکول میں سارا وقت سائنس "رٹتے" گزرتا ہے اور آپ کو پورے ملک میں کوئی "سائنس دان" نامی چیز نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ بدقسمتی سے سائنس "سیکھنے" کی اور خود تجربہ کرنے کی چیز ہے اور ہم اسے بھی "رٹا" لگواتے ہیں۔ لہٰذا اہل علم ودانش سر جوڑ کر بیٹھیں، اس "گلے سڑے" اور "بوسیدہ" نظام ونصاب تعلیم کو اٹھا کر پھینکیں، بچوں کو "طوطا" بنانے کے بجائے "قابل" بنانے کے بارے میں سوچیں اور نوجوان نسل کو عصری تقاضوں کے مطابق اعلیٰ نظریاتی، تربیتی واخلاقی نصاب تعلیم حوالہ کریں۔

خلاصہ بحث:

خلاصہ یہ کہ ایک نظریاتی مملکت کے باشندوں کیلئے نصاب تعلیم بھی نظریاتی اساس کا حامل ہونا لازمی امر ہے۔ کتاب سازی کی ذہنیت سے نکل کر عصری ترجیحات، تربیتی واخلاقی نظریات پر مبنی نصاب سازی میں ہی قوم وملت کی کامیابی مضمر ہے لہٰذا یہ نکتہ اولین فرائض میں سے جان کر اس پر عمل کرنا چاہئے۔ نظریاتی نصاب کی اساس قرآن کریم اور سیرت طیبہ کی تعلیمات پر مبنی ہونی چاہئے تاکہ ہم ہر دور اور ہر شعبہ زندگی خصوصاً اخلاقی وتربیتی اعتبار سے عصری ترجیحات کو مد نظر رکھتے ہوئے صراط مستقیم کے مطابق چلنے اور ملک وقوم کی رہنمائی کے قابل ہو سکیں۔ نظریاتی نصاب میں قرآن کریم اور سیرت طیبہ کے ساتھ ساتھ ہمارے اسلاف کے علم واجتہاد سے بھر پور بیش بہا کتابوں سے بھی بھر پور استفادہ لازمی ہے تاکہ طلبہ میں علمی ذوق کے ساتھ ساتھ اپنے اسلاف کے مستند ماضی، تربیت واخلاق اور خدمات ومراتب سے واقفیت حاصل ہو اور طلبہ اعلیٰ ومجتہدانہ اسلامی ذخیرہ تصنیفات سے روشناس ہوں۔ اس سے ایک تو طلبہ میں عقائد، ایمانیات، حقائق اور اقدار پر ایمان راسخ ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ ان میں پختگی دل ودماغ پیدا ہو جائے گی اور وہ نوپید اذہنی انتشار وکشمکش اور فکری پراگندگی سے محفوظ ہوں گے۔

نظریاتی نصاب کے ساتھ ساتھ اس کے پڑھانے والے بھی نہ صرف نظریات کے موافق وہم خیال ہونے چاہئیں تاکہ نصاب کی افادیت ونافعیت آشکارا ہو، بلکہ ان کا نظریاتی تعلیمی نقطہ نظر اور تخیل سے نہ صرف اتفاق ہو بلکہ اخلاقی وتربیتی اعتبار سے عصری ترجیحات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے پرجوش داعی اور اس کا عملی نمونہ ہوں۔ تاکہ وہ اپنی خداداد علمی وتدریسی صلاحیتوں، ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ عصری تقاضوں کے مطابق اسے نسل نو میں منتقل کر سکیں اور انہیں دنیا میں مثالی کردار کا حامل بنا سکیں تب جاکر ہم مغربی دنیا کا مقابلہ کر سکیں گے اور اپنے آپ کو اخلاقی اعتبار سے عصری ترجیحات وضروریات کے مطابق ایک کامیاب معاشرے کا حصہ قرار دے سکیں گے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوان نسل کو جدید ترجیحات کو مد نظر رکھتے ہوئے عصری تقاضوں کے مطابق اعلیٰ نظریاتی، تربیتی واخلاقی نصاب تعلیم حوالہ کریں ورنہ آنے والے اوقات ہمیں کبھی بھی معاف نہیں کریں گے۔

حوالہ جات

[1]ندوی، مولانا سید ابو الحسن علی، اسلام اور علم، سید احمد شہید اکیڈمی، بریلی، 1433ھ، ص36

[2]دریابادی، مولانا عبد الماجد، ملتِ اسلامیہ اور عصرِ حاضر کے تقاضے، سندھ نیشنل اکیڈمی، حیدرآباد، 2006ء، ص:193-192

[3]شاہد، ایس ایم، اسلامک سسٹم آف ایجوکیشن، مجید بک ڈپو اردو بازار، لاہور، س ن، ص202-201

[4]ندوی، مولانا سید ابو الحسن علی، مدارس اسلامیہ، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س ن، ص38

[5]ندوی، مولانا سید ابو الحسن علی، حدیثِ پاکستان، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س ن، ص94

[6]ندوی، مولانا سید ابو الحسن علی، ہندوستانی مسلمان، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س ن، ص189

[7]ایضاً

[8]حوالہ سابق، ملتِ اسلامیہ اور عصرِ حاضر کے تقاضے، ص119

[9]حوالہ سابق، اسلامک سسٹم آف ایجوکیشن، ص205-206

[10]الخطیب العمری، ابو عبد اللہ ولیّ الدین محمد بن عبد اللہ، مشکوٰۃ المصابیح، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، 2001ء، 1:22

[11]دہلوی، علاّمہ نواب محمد قطب الدین خانؒ، مظاہرِ حق، لاہور، المصباح، سن ندارد، ص172-173

[12]ندوی، مولانا سید ابو الحسن علی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام، کراچی، 1976ء، ص242-243

[13]حوالہ سابق، مدارس اسلامیہ، ص38-39

[14]ندوی، مولانا سید ابو الحسن علی، کاروانِ زندگی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، 1983ء، 1:200

[15]حوالہ سابق، حدیثِ پاکستان، ص96

[16]حوالہ سابق، ملتِ اسلامیہ اور عصرِ حاضر کے تقاضے، ص243

[17]البیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی، سنن کبری للبیہقی، باب بیان مکارم الاخلاق، کتب خانہ رشیدیہ، محلہ جنگی، پشاور، س ن، 10: 356

[18]سراج الدین، عبد اللہ، علامہ، الھدي النبوي والإرشادات المحمدیۃ إلی مکارم الأخلاق و محاسن الآداب السنیۃ، مشکاۃ الاسلامیہ، 15-12-1433ھ، عدد القراء3166

[19] http://www.urdudost.in/?p=1292#comment-323

[20]عسقلانی، شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی، الاصابۃ، داراحیاء التراث العربی، بیروت، 3:102

[21]عطار، فرید الدینؒ، تذکرۃ الاولیاء، شمع بک ایجنسی، لاہور، س ن، ص146

[22]مجددی، غلام مصطفیٰ، رسائل مجدد الف ثانیؒ، قادری رضوی کتب خانہ، لاہور، 1430ھ/2009ء، ص31

[23]ترمذی، ابو عیسی محمد بن عیسی، السنن، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، 2: 14

[24] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: الدارمي، التميمي السمرقندي، أبو محمد عبد الله بن عبد الرحمن بن الفضل بن بَهرام بن عبد الصمد، مسند الدارمي المعروف ب- سنن دارمی، دارالمغني للنشر والتوزيع، السعودية، الطبعة الأولى، 1412ھ- - 2000م، مبحث الادب

[25] https://www.facebook.com/Shaheenplus/posts/1929993930416827?